© rasailojaraid.com

مظفر حسین

اقبالؒ فہمی کی ایک راہ

27

سب سے پہلی بات جو مطالعۂ اقبال میں مجھے محسوس ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبالیات کا کوئی بھی طالب علم اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ علامہ اقبال کا دردِ تنہائی ہے جو ابلاغ پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود پوری زندگی علامہ اقبال کے جذبات اور احساسات پر ایک مستقل بوجھ بنا رہا جس کی شدت میں کوئی کمی ان کے شاعرانہ کمال اور حکیمانہ جوہر کے بھرپور اظہار کے بعد بھی واقع نہ ہوئی۔ اسرارِ خودی کے آخر میں یہ دعائیہ اشعار کس قدر پرسوز اور حسرت آمیز ہیں۔

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارِ غمگسارے تا کجا — جستجوئے رازدارے تا کجا
من مثالِ لالۂ صحرا ستم — درمیانِ محفلے تنہا ستم
خواہم از لطفِ تو یارِ ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے

دل بدوش و دیدہ بر فردا ستم — درمیانِ انجمن تنہا ستم

کسی بھی پیغام بر کے لئے جو اپنے پیغام کے بارے میں انتہائی درجہ سنجیدہ ہو یہ احساس ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی بات کو نہیں سمجھتے۔ بالِ جبریل کے ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر جس میں آپ نے "یہاں مرے رازداں اور بھی ہیں" کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کے کلام سے بالعموم یہی تاثر ملتا ہے کہ آپ کو اپنی کاوشِ ابلاغ کی ناکامی کا گہرا احساس ہے۔ چنانچہ ان کی آخری رباعیات میں جو ارمغان حجاز میں شامل ہیں یہ تاثر اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چو دیدم جوہرے آئینۂ خویش — گرفتم خلوت اندر سینۂ خویش
ازاں دانشوران کور و بے ذوق — امیدم با غمِ دیرینۂ خویش
بچشمِ من جہاں جز رہگذر نیست — ہزاراں رہرو و یک ہم سفر نیست
گزشتم از ہجوم خویش و پیوند — کہ از خویشاں کسے بیگانہ تر نیست
چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

کیا علامہ اقبال کا یہ احساس تنہائی مخاطبین سے اپنے ذہنی فاصلوں کی بنا پر تھا یا اپنے بنیادی موقف کے التباس میں پڑ جانے کی وجہ سے ؟ میرے خیال میں یہ سوال ہمارے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی شخصیت جس کی پوری ہستی کی تار و پود غور و فکر پر مبنی ہو وہ محفل آرائی اور گرمی گفتار کے باوجود دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ ذہنی زندگی بسر کرتی ہے اور یوں احساسِ تنہائی اس کے لئے مقدّر ہو جاتا ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ درست سہی لیکن علامہ اقبال کو تو عمر بھر یہ گلہ بھی رہا ۔

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من — از درونِ من نجست اسرارِ من

پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ فکر اقبال کے فہم کے لئے "ظن خود" سے کام لینے کی بجائے خود علامہ اقبال کے اپنے واضح فرمودات سے مطالعۂ فکر اقبال کی صحیح نہج متعین کی جائے ۔ حضرت علامہ نے جاوید نامہ میں نژادِ نو سے خطاب میں اپنے شعر و فلسفہ کی غایت واضح الفاظ میں یوں بیان فرما دی ہے ۔

28

من بطبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف — کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرفِ پیچاپیچ و حرفِ نیش دار — تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار
اصل ایں از ذکر و اصل آں ز فکر — اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر
آبجوئم از دو بحرِ اصلِ من است — فصلِ من فصل است و ہم وصلِ من است
تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد — طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد

یہ اشعار اس بات کا کھلا اعلان ہیں کہ وہ "مزاجِ عصر" کو بدلنا چاہتے ہیں اور شعر و فلسفہ کو آپ نے فقط ذرائعِ ابلاغ کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ ان کا مقصد اِحیائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم کے سوا اور کچھ نہیں۔

محفل از شمع نوا افروختم — قوم را رمزِ حیات آموختم
نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

چنانچہ جو لوگ انہیں محض ایک شاعر اور سخنور کی حیثیت سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں ان سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ 29

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست — کہ بر من تہمت شعر و سخن بست
او حدیثِ دلبری خواہد زمن — رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیِ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید
نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنے آپ کو کبھی شاعر نہیں سمجھا، فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جس کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔"

شاعری کے علاوہ تشکیل جدید کے لیکچروں کے بارے میں بھی جو ان کے مخصوص فلسفہ کے حامل سمجھے جاتے ہیں، ان کی اپنی رائے کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے غلام بھیک نیرنگ کے نام لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں۔

"ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں۔ اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں پیش کیا جائے اور اگر پرانے خیالات میں کچھ خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے۔ اور اس تعمیر میں میں نے اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ رکھا ہے۔"

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے ان لیکچروں کا مخاطب ایک خاص ذہن رکھنے والا طبقہ ہے جس کی مخصوص ذہنیت کی مناسبت سے گفتگو کی گئی ہے۔ چنانچہ اس موقف کی روشنی میں تشکیل جدید میں پیش کردہ افکار و نظریات کو علامہ اقبال کا فلسفہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جیسے کہ آپ نے خود وضاحت فرما دی ہے ان لیکچروں میں آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اسلام ہی کی بہترین فکری روایات کو جدید فلسفہ کی زبان میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور فلاسفہ مغرب کے افکار و نظریات کا اگر کہیں سہارا لینے کی کوئی کوشش ملتی بھی ہے تو وہ محض مخاطبین خاص کی ذہنی رعایت سے ابلاغ کی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہے نہ کہ قدیم و جدید کی پیوند کاری کے لئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے قدیم اور جدید اور مشرق و مغرب کے درمیان مکالمہ کی راہ ہموار کی ہے۔ اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ فلاسفۂ مغرب کی حیثیت ان کے نزدیک دانشِ مغرب کی دلدل میں پڑے ہوئے ایسے پتھروں سے زیادہ نہیں جن پر قدم رکھتے ہوئے آپ اسلام کی بہترین فکری روایات کی طرف رہنمائی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دُنیائے مغرب میں واحد جانے پہچانے اسلامی مفکر صرف علامہ اقبال ہی ہیں اور مغرب میں اسلام کو سمجھنے کی تحریک پیدا کرنے میں تشکیل جدید کا بڑا حصہ ہے۔

30

علامہ اقبال نے بڑے ہی زوردار طریقے سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کا پیغام درحقیقت قرآن ہی کا پیغام ہے۔ وہ رومی کو اپنا پیرومرشد مانتے ہیں۔ جن کی مثنوی کے بارے میں "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے۔

رموزِ بیخودی کے آخر میں آپ نے حضورؐ رحمت العالمین میں نہایت درد انگیز لہجہ میں دُعا کی ہے کہ اگر ان کے پیغام میں کوئی غیر قرآنی بات شامل ہو گئی ہو تو ان کی ناموس فکر کا پردہ چاک کر دیا جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں وہ اپنے حق میں ایسے بددعا مانگتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے بے پناہ عشق اور تعلقِ خاطر کے پیش نظر اس سے زیادہ سخت بددعا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس زوردار اور واشگاف اعلان کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ علامہ اقبال کے کلام اور فلسفہ کو سمجھنے کے لئے قرآن سے رجوع کس قدر ضروری ہے۔ چونکہ قرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا اصل جوہر ہے اس لئے فکرِ اقبال کے فہم کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ ان کے خیالات و افکار کے اصل سرچشمہ یعنی قرآن کی طرف رجوع کیا جائے ۔ میری ناچیز رائے میں اگر یہ بنیادی شرط پوری نہ ہو تو اقبال کے فکر تک رسائی ممکن نہیں ۔ لیکن اسی بات سے اب تک افسوس ناک حد تک تغافل برتا گیا ہے ۔ اور سارا کمال اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ اقبال پر مغربی فلاسفہ کا زیادہ اثر ثابت کیا جائے جن کی حیثیت خود علامہ اقبال کے نزدیک سنگہائے رہگذر سے زیادہ نہیں ۔ اور ان میں سے ایک ایک کو وہ خود مسترد کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف وہ اپنے لیکچرز میں برگساں کے اقوال کو بطور سند استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں ۔

31

تو اگر اپنی خودی نہ کھوتا   زناریٔ برگساں نہ ہوتا

اسی طرح اگر وہ ہیگل کے قانونِ تضاد و پیکار سے متاثر دکھائی دیتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں ۔

ہیگل کا صدف گہر سے خالی   ہیں اس کے طلسم سب خیالی

یہی حال نٹشے اور کانٹ کا ہے ۔ نٹشے کے بارے میں ان کے اشعار قابل توجہ ہیں ۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں   تو اقبالؒ اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے ؟

آنکہ برطرح حرم بت خانہ ساخت   قلب او مومن دماغش کافر است

اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں میں معدودے چند لوگ ہی ایسے ملیں گے جو قرآن سے اقبال کے اس پائیدار رشتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال کے بنیادی تصورات کو قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کریں ۔ مثال کے طور پر "خودی"، کو ہی لیجیے جو فکرِ اقبال کا بنیادی تصور ہے بلکہ ان کا پورا فلسفہ اور کلام نکتۂ خودی ہی کی تشریح و تفسیر ہے میں ایک عرصہ تک اس تلاش میں رہا کہ کسی ماہر اقبالیات کی کوئی ایسی تحریر مل جائے جس میں علامہ اقبال کے اس تصور کی قرآنی اساس بیان کی گئی ہو لیکن مجھے اپنے اس عجز کا اعتراف ہے کہ کسی بھی مصنف کے ہاں بات ایک ایسی حدیث سے آگے نہ بڑھی جس کی سند بعض علما کے نزدیک ضعیف ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں خودی کا وہ تصور کیونکر اجاگر ہو جو اقبال کا مقصود و مطلوب تھا ۔ اور جس کے بارے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ فرماتے ہیں۔ ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغِ فساں لا الٰہ الا اللہ

مومناں با خوئے و بوئے کافراں — لا الٰہ گویاں و از خود منکراں

بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار — دو صد بار از مقام خود فتادم

اس سلسلے میں عام طور پر بات "خود داری"، "خود اعتمادی" اور "تعمیر شخصیت" سے آگے نہیں بڑھتی جو سب کے سب اس اعتبار سے بے رنگ الفاظ ہیں کہ لادین معاشروں میں بھی تو خود داری، خود اعتمادی اور تعمیر شخصیت اور کردار سازی پر زور دیا جاتا ہے۔ پھر کیا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جو علامہ اقبال کے پیش نظر تھا؟ حالانکہ علامہ اقبال جب لا الٰہ الا اللہ کو خودی کا سرِ نہاں قرار دیتے ہیں تو آپ انسان کی شخصیت میں صبغۃ اللہ یعنی اللہ کا رنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے یہ بات بہت کھول کر واضح کر دی ہے کہ خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے اور علامہ اقبال بھی یہی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ رشتۂ عبودیت قائم و استوار رکھنے سے ہی خودی میں وہ اطناب یا تناؤ پیدا ہوتا ہے جو خودی کی حقیقی زندگی ہے۔ اور انسانی شخصیت اس صلابتِ کردار سے بہرہ ور ہوتی ہے کہ اپنے ماحول میں کوئی انقلاب لا سکے۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں لکھتے ہیں 32

"کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے جزوی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی تصنیفات میں اسی صداقت کو پیشِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

انقلاب خواہ زندگی کے جزوی (یعنی انفرادی) پہلو میں لانا مقصود ہو یا اجتماعی (یعنی قومی) پہلو میں، کلمہ طیبہ کا اصول توحید دونوں جگہ ایک ہی کام کرتا ہے۔ اور وہ فقط یہ ہے کہ نجی اور قومی زندگی کے معاملات تعلق باللہ اور قانون الٰہی کی روشنی میں انجام پائیں اور شاید یہی مفہوم لیا ہے علامہ اقبال نے اس آیت کا جسے آپ نے تشکیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدید کے دیباچے میں درج کیا ہے۔

وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدہ

یعنی زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا قانون حیات و ثبات ایمان میں مضمر ہے یعنی ایمان اگر فرد کو ایک نئی زندگی بخشتا ہے تو اسی ایمان سے ہی قوم بھی زندگی پاتی ہے بقول ڈاکٹر برھان احمد فاروقی ہمارے مفسرین قرآن میں سے کسی نے بھی کلمہ طیبہ کی ایسی جامع و مانع تشریح و تفسیر نہیں کی جیسی کہ علامہ اقبال نے کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس قول میں رتی بھر مبالغہ نہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رہنمائی کے لئے کلمہ طیبہ کی معنویت کو جس خوبی سے علامہ اقبال نے واضح کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اگر علامہ اقبال "لا" کی تشریح "مژدہ لا قیصر و کسریٰ کہ داد" اور "سلاطین لا کلیسا لا الہ" جیسے باغیانہ الفاظ میں نہ کرتے اور "الا" کی تشریح میں 33

کردہ کار خداونداں تمام　　بگذر از لا جانب الا خرام

جیسے اشعار نہ لاتے تو وہ پاکستان کا مطلب کیا - لا الہ الا اللہ کبھی ایجاد نہ ہو پاتا جو مسلمانان ہند کے لئے انگریز اور ہند کے سیاسی تفوق سے بغاوت اور پاکستان میں خلافت الٰہیہ کے قیام کے لئے محرک ثابت ہوا۔

اپنی زندگی میں علامہ اقبال نے پوری کوشش کی کہ ان کے شارحین اور ناقدین ان کے فکر کی حقیقی اساس قرآن اور "اسلام کی فکری روایات" ہی کو قرار دیں مثلاً جب ڈاکٹر نکلسن نے مثنوی اسرار خودی کا اردو میں ترجمہ کیا تو آپ نے محض اس خوف سے کہ کہیں خودی کی اصطلاح کو غلط معنی نہ پہنا دیئے جائیں۔ نکلسن کے نام ایک خط لکھا اور اپنے مخصوص تصور خودی کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔

"پھر زندگی کیا ہے؟ یہ انفرادی ہے اور اس کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت پیدا ہو سکی ہے خودی ہے جس میں فرد فی نفسہ مکمل مخصوص مرکز کی حیثیت رکھتا ہے - جسمانی اور روحانی طور پر انسان فی نفسہ مکمل ہے لیکن یہ مکمل فرد نہیں۔ یہ خدا سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر اس کی انفرادیت یا شخصیت بھی کم ہوگی جو سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ خدا کے نزدیک آئیگا مکمل ترین انسان ہوگا۔

اسی خط میں بطور خاص یہ ذکر بھی فرمایا۔

بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ لیکن ان کی واضح تصریحات کے باوجود ہمارے ہاں محققین اقبال نے بڑا کارنامہ یہی سمجھ رکھا ہے کہ علامہ اقبال کے مردِ مومن یا نائب حق کا رشتہ خواہ مخواہ نطشے کے فوق البشر سے جوڑا جائے اور "حکایت الماس و زغال" سے اس کی دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ مثال نطشے سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال نے اسرارِ خودی کا انتساب یا آغاز مولانا رومی کے جن اشعار سے کیا ان کے پیش نظر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ علامہ اقبال نے مردِ مومن یا نائبِ حق کا تصوّر رومی سے لیا ہے۔

34

دی شہر باچراغ ہمی گشت گرد شہر — از دام و دملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافتہ نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور مولانا روم پر ہی کیا موقوف ہے غور سے دیکھا جائے تو قرآن کا بنیادی موضوع ہی تلاش انسان ہے اور علامہ اقبال کی ساری کاوش اسی انسان کی ایک جھلک دکھانے کے لئے وقف ہے جس کا خود خدا آرزومند ہے۔

ما از خدا گم ایم و او بہ جستجوِ ماست — چوں ما نیازمند و گرفتار آرزو است

پھر علامہ اقبال نے اپنے تصور خودی کی وضاحت کے لئے اسلامی تاریخ سے سیرت و کردار کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے یہ بات اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ علامہ اقبال کا حقیقی سرچشمہ فکر (SOURCE OF INSPIRATION) کیا ہے۔ ان کی شاعری کی پوری فضا اسلامی تاریخ و افکار سے مستعار ہے۔ صدیقؓ و فاروقؓ، عثمانؓ و علیؓ، بلالؓ و سلمانؓ، خالدؓ و حسینؓ رضی اللہ عنہم اور جنیدؒ و بایزیدؒ کی زندگیوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کئے بغیر ان کے اشعار کی معنویت سے آشنا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

اپنے آخری ایام میں آپ نے نطشے پر ایک تفصیلی نوٹ سید نذیر نیازی صاحب کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لئے املا کروایا تھا کہ اس غلط فہمی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور کر دیا جائے کہ آپ کے تصور خودی کو نٹشے سے دور کا بھی کوئی تعلق ہے ۔ اب علامہ اقبال کی بار بار وانشگاف تصریحات کے بعد بھی اگر آپ کے تصور خودی کا سرا نٹشے کے افکار سے جوڑنے پر اصرار کیا جاتا ہے تو کیا یہ ان پر ظلم نہیں ؟

میری گذارشات کا مقصد فقط یہ ہے کہ ہمیں علامہ اقبال کی فکر کو قرآن اور اسلامی روایات ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ اس سے ہٹ کر جو کوشش بھی ہوگی وہ ہمیں کسی اور ہی سمت میں لے جائے گی جو علامہ اقبال کا مقصود نہیں ۔ میں اپنی بات ایک سادہ سی مثال سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا ۔ ساقی نامہ کا شعر ہے ۔ 35

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

ایک اشتراکی اقبال کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد طبقاتی جنگ ہے اور علامہ اقبال جس راز کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں وہ مارکس کا مادی جدلیاتی فکر ہے ۔ حالانکہ علامہ اقبال کے پیش نظر جو صورت واقعیہ (CONCRETE SITUATION) موجود تھی وہ برطانوی استعمار کی گرفت تھی جس کی طرف علامہ اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ۔

نزاناداں اُمید غمگسار یہا ز افرنگ است — دل شاہین نہ لرزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

چنانچہ یہ سیاسی استعارہ علامہ اقبال نے ایک دوسری جگہ یوں استعمال کیا ہے ۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

عمر بھر علامہ اقبال کے پیش نظر یہی مقصد رہا کہ کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کیلئے سوز یقین سے اس کا لہو گرما دیا جائے ۔ ان کے نزدیک وحی و الہام بھی وہی معتبر ہے جو قوت و شوکت کا پیغام دے ۔ جو بلبل میں شاہین کی ادا پیدا کرے ۔

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام — ہے اسکی نگاہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی — ہو جاتی ہے خاک چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار — کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے نزدیک دین حقہ قوت و شکوہ اور سیاسی غلبے کو مقتضی ہے۔ آپ کے نزدیک اسلام کا خدا درحقیقت قوت کی علامت ہے یعنی خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے۔ اسی لئے مردِ مومن کے لئے آپ نے شاہین کو بطور علامت استعمال کیا اور کنجشک فرومایہ بلبل، مرغ سحر خیز اور ممولے میں آپ شاہین اور شہباز کے اوصاف پیدا کرنے کے لئے مضطرب رہے۔ لیکن شاہین و ممولے کے اس استعارہ کے پیچھے ایمان ہی وہ راز ہے جس سے علامہ اقبال ہمیں آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے اگر ہم یہ جان لیں کہ علامہ اقبال نے یہ استعارہ مولانا جامی کی تصنیف "نفحات الانس" میں مذکورہ ایک واقعہ سے لیا ہے جس میں یہ اخلاقی سبق مضمر ہے کہ اللہ کا نام اور اس پر ایمان مسلمان قوم کی ناتوانی کو قوت و غلبہ میں بدل سکتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ امام رازیؒ کے پیر و مرشد حضرت نجم الدین کبریٰ ایک دفعہ کسی خاص کیفیت میں مراقب بیٹھے تھے کہ دفعتاً فضا میں ایک ممولے کی دردناک چیخ و پکار نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آپ نے نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عقاب ممولے پر جھپٹ رہا ہے۔ بیچارگی اور مظلومی کے اس منظر سے آپ بہت متاثر ہوئے اور آپ نے بے ساختہ جوش میں فرمایا "اللہ معنا" ممولا پلٹ کر عقاب پر حملہ آور ہوا اور اپنی ننھی سی منقار سے عقاب کو شہ رگ سے دبوچ کے نیچے زمین پر مار گرایا۔ علامہ اقبال نے اس واقعہ کو ایک باقاعدہ استعارہ کی حیثیت دے کر اسے تعلق باللہ کے سبق کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ شہباز اور ممولے کے قصّے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

کبوتر بچہ خود را چہ خوش گفت — کہ نتواں زیست با خوئے حریری
اگر "یا ہو" زنی با مستی و شوق — کلہ را از سرِ شاہیں بگیری

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ صحیح تہذیبی پس منظر سامنے آجانے سے شعر کا مطلب بالکل دو ٹوک واضح ہو گیا۔ علامہ اقبال کے ذہن کے پس پردہ اسلام کا جو تہذیبی ورثہ کارفرما ہے اصل ضرورت اس کو نمایاں کرنے کی تھی اور اسی سے ہم ابھی تک غافل ہیں اور علامہ اقبال ایک عالمِ آزردگی و افسردگی میں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

© rasailojaraid.com